۱۵ مئی ۱۹۷۱ء

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۳۰ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۱۹

اس شمارے میں

اداریہ

اردو گھر کی تعمیر

شروع ہونے والی ہے

اردو دوستوں کو عموماً اور انجمن ترقی اردو ہند کے ممبروں اور شاخوں کے کارکنوں کو خصوصاً یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ڈھائی سال کی تاخیر کے بعد بالآخر اردو گھر کی تعمیر کا کام شروع ہونے والا ہے۔ اردو گھر کے نقشے کی منظوری میں دلی سرکار کے دفتری تساہل کی وجہ سے ڈھائی سال لگ گئے۔ بالآخر صدر انجمن اور کرنل بشیر حسین زیدی کی خاص کوششوں سے یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔ صدر انجمن نے ٹھیکیداروں سے ٹنڈر طلب کئے ہیں جو ۲۱ مئی کو کھولے جائیں گے۔ مجلس عاملہ کی ۱۲ مئی ۱۹۷۱ء کی میٹنگ میں صدر انجمن اور کرنل بشیر حسین زیدی کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کسی مناسب ٹھیکیدار کو تعمیر کا کام سپرد کریں اور کام کی نگرانی کے لئے انجمن کی طرف سے کارکن بھی مقرر کریں۔ یہ تو ہم اعلان کر چکے ہیں کہ انجمن کے پاس ڈیڑھ لاکھ روپیہ تعمیر عمارت فنڈ میں محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً بیس ہزار روپیہ زمین کی خریداری، حکومت سے معاہدے اور سالانہ کرایہ پر خرچ ہو چکا ہے۔ حکومت ہند کی طرف سے چار لاکھ کے عطیے کا بھی اعلان ہو چکا ہے اس کی تفصیلات پر وزیر تعلیم سے بات کرنے کے لئے بھی صدر انجمن کو مجاز قرار دیا گیا ہے اور ان کی مدد کے لئے مجلس عامہ نے ایک کمیٹی بھی بنا دی ہے عمارت کی تعمیر پر آٹھ لاکھ کے خرچ کا اندازہ کیا گیا تھا جو آئے دن بڑھتی ہوئی گرانی کے پیش نظر نو لاکھ تک جا سکتا ہے اس لئے اب ہمیں خواص و عوام سے ساڑھے تین لاکھ روپیہ جمع کرنا ہے ہماری کوشش یہ ہوگی کہ عام اردو برادری سے ایک لاکھ جمع کیا جائے۔ اب تک سولہ ہزار کے قریب جمع ہو چکا ہے۔ اگر ہمارے وہ ہمدرد اور دوست جو چندے کی رسیدیں لے چکے ہیں اپنے کام کی رفتار تیز کر دیں تو چند مہینے میں آسانی سے ایک لاکھ جمع ہو سکتا ہے۔ ابھی تک ہماری ریاستی اور مقامی شاخوں نے چندے کے کام میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ ان سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اس اہم موقع پر مرکز کی مدد کے لئے مستعد ہو جائیں اور اپنی وسعت اور بساط کے مطابق ایک رقم طے کر کے اس کی فراہمی کے لئے جلد سے جلد مناسب تدابیر اختیار کریں۔ انجمن کی مجلس عامہ کے ہر ممبر کے ذمے کم سے کم ایک ہزار کی رقم کی گئی ہے۔ کچھ ممبروں نے اپنے حصے کا چندہ جمع کر دیا ہے لیکن ابھی بہت بڑی تعداد کو اپنا فرض انجام دینا ہے۔ اردو گھر کی تعمیر کا کام اللہ نے چاہا تو اگلے مہینے شروع ہو جائے گا۔ جولائی سے انجمن کے وفود مختلف ریاستوں اور مرکزی شہروں کا دورہ کریں گے۔ وہاں مقامی کمیٹیاں بنائیں گے۔ ریاستی حکومتوں سے اپیل کریں گے، اہل خیر اور صاحب استطاعت اشخاص کے پاس جائیں گے۔ ان قومی اداروں اور ٹرسٹوں کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے جو قومی کاموں میں مدد کرتے ہیں۔ بمبئی، دلی، حیدرآباد اور

دوسرے بڑے شہروں میں تہذیبی اجتماع کریں گے جن میں ٹکٹ کے ذریعہ سے داخلہ ہوگا۔ انجمن کی مختصر تاریخ معہ انجمن کے سابق اور موجودہ اہم عہدہ داروں کی تصاویر اور موجودہ ممبروں کے ناموں کے ایک کتابچے کی صورت میں اردو، ہندی، انگریزی میں شائع کرنے کے انتظامات ہو رہے ہیں۔ جو لوگ اردو کی ترقی سے مایوس ہیں انھیں ان کی مایوسی مبارک۔ ہم کو اردو پر، اردو دوستوں پر اور اپنے ملک پر اعتماد ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ بڑھتی ہوئی گرانی اور زندگی کی آئے دن کی مشکلات نے لوگوں کو بہت متاثر کیا ہے۔ مگر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اردو سے اور ان قدروں سے جن کی اردو علمبردار ہے، آج بھی ایک بہت بڑے طبقے کی عقیدت اور محبت وابستہ ہے۔ اسی کے بھروسے پر ہم پھر "اردو گھر" کے لئے فیاضانہ امداد کی اپیل کر رہے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ یہ آواز ضرور خاطر خواہ اثر دکھائے گی۔

مجلس عام کے چار نئے ممبر

انجمن کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ بدھ ۱۲ر مئی کو شام کے پانچ بجے، سپرو ہاؤس نئی دہلی میں منعقد ہوا جس میں مجلس عام کی چار خالی جگہوں کے لئے آئے ہوئے ووٹوں کا شمار کیا گیا۔

حسب ذیل حضرات منتخب ہوئے۔

۱۔ عابد علی خاں، ایڈیٹر سیاست حیدرآباد
۲۔ ڈاکٹر حسینی شاہد، پرنسپل اردو آرٹس کالج حیدرآباد
۳۔ ڈاکٹر اختر اورینوی، صدر شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی
۴۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، فیلو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈی شملہ۔

اردو گھر کی تعمیر کے لئے جو ٹنڈر طلب کئے گئے ہیں وہ ۲۱ر مئی کو سپرو ہاؤس میں کھولے جائیں گے۔ مجلس عاملہ نے طے کیا کہ صدر اور کرنل بشیر حسین زیدی کسی مناسب ٹنڈر منظور کریں، کام کرنے کے لئے ایک نگراں مقرر کریں اور اس کے علاوہ تعمیر کے سلسلے میں ضروری انتظامات کریں۔

• آل احمد سرور

پروفیسر شیرانی کے مزار کی تعمیر مکمل

پروفیسر حافظ محمد محمود خاں شیرانی مرحوم و مغفور کے مزار کی تعمیر کے سلسلے میں ہند و پاک کے اہل ذوق و اہل ادب اور باشعور حضرات کو یہ معلوم کرکے یقیناً مسرت ہوگی کہ حضرت پروفیسر حافظ محمد محمود شیرانی مرحوم و مغفور کے مزار کی تعمیر گذشتہ ۲۲ر مارچ کو پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہے۔

• محمود رشید

چھوٹی صنعتوں پر اردو میں پہلی کتاب

صنعت و حرفت کے موضوع پر زیر طبع کتاب "چھوٹی صنعتیں"، از مظاہر شیخ، جو اساسی، تکنیکی و کاروباری انڈسٹریز پر اپنی نوعیت کی اردو میں پہلی کتاب ہوگی، تین جلدوں میں شائع ہو رہی ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق یہ مئی ۱۹۸۱ء میں تیار ہو جائے گی۔

کتاب کے سلسلے میں مزید معلومات سول ایجنٹ اسکول اینڈ کالج بک سنٹر، ڈونگر روڈ، ناگپاڑہ، بمبئی ۸ سے کیجیے۔

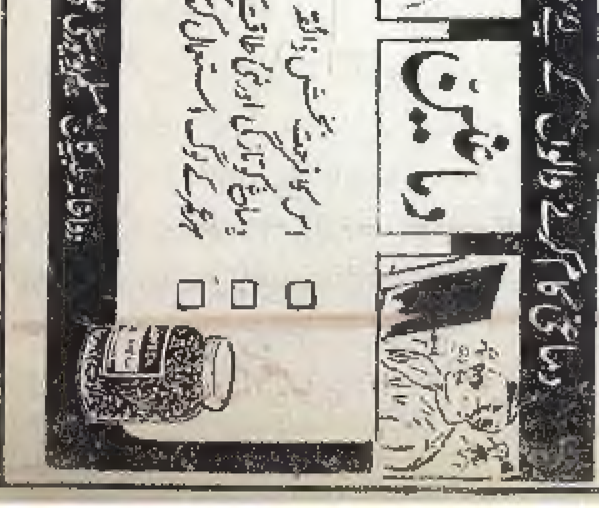
نامہ نگار

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

اردو میں ادبی و تحقیقی کام کرنے والے بیرونی حضرات کے لئے بمبئی میں قیام کا مسئلہ مشکل ہوتا ہے اور اس وجہ سے بعض حضرات بمبئی آنے میں پس و پیش کرتے ہیں لہٰذا اس دشواری کو دور کرنے کی غرض سے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے ہر سال تعطیلات گرما و سرما (یکم مئی تا ۱۰ر جون — ۱۰ر اکتوبر تا یکم نومبر) میں انسٹی ٹیوٹ میں بلا معاوضہ اقامت کا انتظام کیا ہے۔ جو حضرات اقامت کی سہولتیں چاہتے ہوں وہ ڈائرکٹر سے خط و کتابت کریں۔

پتہ: ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲۔
ڈاکٹر دادا بھائی نوروجی روڈ، بمبئی ۱

• سید ظہیر الدین ڈائرکٹر



مرزا سعید الظفر چغتائی

ایک عورت کی تصویر

فرانسیسی اخبار (۲)

پیرس کے روزنامے فگارو اور اس کے ادیب وقائع نگار گرمانت کا تذکرہ ۵ / اپریل کی اشاعت میں آچکا ہے۔ گرمانت کا یہ نمونۂ تحریر اسی فرانسیسی اخبار سے لے کر پیش کیا جاتا ہے۔ مضمون کی اہمیت یہ ہے کہ ایک مصوری کے نمونے سے بات شروع ہو کر اس عورت کے سوانح تک پہنچتی ہے، جس کی تصویر ہے اور جو خود تصویر تھی۔ اردو ادبیات میں جاذبیت کے تصور رعنائی تخیل کے قلم سے رومانوی ادب کے وہ جواہر پارے رقم ہوئے جو ان کی فارسی غزلوں اور بعض اردو خطوں میں ملتے ہیں۔ اقبال کے ذہن کو اس سرمایۂ نشاط کا عطیہ تو نہ مل سکا، لیکن علامہ نے اپنی زندگی کے ایک نازک دور میں انگریزی خطوں کے ذریعہ اگرچہ کسی کو ہمراز بنا کے سینے کا بوجھ ہلکا کیا، تو اسی ہندوستانی خاتون کو جنھوں نے علامہ کے طالب علمانہ قیام یورپ کے بعض بڑے بڑے جمالیات کا مشاہدہ کیا تھا لیکن ہمارے یہاں ایسی مثالیں طبقاتی شاذ ہیں۔ مغربی دنیا کا معاشرہ جو

"بہت ہی غم ہستی، شراب کم کیا ہے" کا احساس قدم قدم پر دلاتا ہے۔ وہاں انسان محسوس کرتا ہے کہ یہ حد سے حد تک غم و الام سے بھری زندگی بہر حال جینے کے لائق ہے اور شیشن کے سوڈ تک اس نے کھا لینے کی آرزو ہوتی ہے کہ ان کے صلے میں امرت کا ایک گھونٹ نہ سہی، اس کی چند بوندیں تو کام و دہن کو سیراب کر ہی دیں گی۔ گرمانت کی یہ مختصر حکایت افسانہ در افسانہ ہے۔ ایک لڑکی کو اس کی تقریباً تنہا ماں پالتی ہے۔ عنفوان شباب ہی سے لڑکی کسی چائے خانے یا تماشا گاہ میں کام کر کے روزی کمانے پر مجبور ہے۔ یہاں اس کو دوست ملتے ہیں، جو اسے زیادہ بڑی جگہوں پر لے جاتے ہیں۔ اس کے تعارف بڑھتے ہیں اور انیسویں صدی کے فرانس کے جلیل القدر ادیب، عالم، شاعر اور مصور اپنی جھلکیاں دکھاتے اور بعض اوقات اس کی زندگی میں داخل ہوتے ہیں۔ مضمون میں یہ کردار کتنی معلوم اور نامعلوم معصوم کہانیاں زبان حال سے کہہ جاتے ہیں۔ یہ فرانسیسی پیرس کی تہذیب کے ایک پہلو کا ایسا جیتا جاگتا شاہکار ہے، جس میں الفاظ کے سہارے جبینیں ابھرتی ہیں، در و بام جاگتے ہیں اور پھر ایک میٹھی نیند سو جاتے ہیں۔ عبارت سے پورا لطف اٹھانے کے لئے حواشی پڑھ لینے کی پر زور سفارش کرتا ہوں۔

"گذشتہ ہفتے کسی نامعلوم مصور کی بنائی ہوئی ایک جوان عورت کی خاصی حسین تصویر نیلام گاہ میں بک رہی تھی۔ سر کانوں کے پاس ہاتھوں میں ٹکا ہوا، انگلیاں سنہری تابدار زلفوں میں الجھی ہوئی یا ابھرتی صورت، روحانی چہرہ نازک ہونٹوں سے جھانکتی ہوئی کھوئی ہوئی مسکراہٹ لگتا ہے۔ کسی اور ہی زمانے کی عورت کا چہرہ جو ہمیں، لاکھ غیر شعوری طور پر سہی، ایک لمحے کے لئے یہ آرزو کرنے پر مجبور کر دے کہ ہم اس ماضی میں بچے ہوتے۔ ہمارے تخیل میں ایسی آتشیں نازنینائیں ضرور ہی ہوں گی، جن کا تعلق ہماری تخیلی یادوں اور تصوراتی زندگی سے رہا ہو۔ میں نے اس تصویر کو خریدنا چاہا، مگر اس کا جادو تنہا مجھی پر تو نہیں چلا تھا۔ ماہروں کے اندازے سے قیمت کہیں اوپر گئی۔ تسلی یوں ہوتی ہے کہ وہ لمحہ آج کتنا ہی دور کیوں نہ معلوم ہو، جب چاہوں گا سفر کر کے اورنیری کے کل دے عجائب خانے میں اسے دیکھ آسکوں گا، کیونکہ اسی عجائب خانے کے لئے اسے خریدا گیا ہے۔ وہ یقیناً ان حسنوں کو بیدار کرنے والی

ملک زادہ منظور احمد

غزل

دل کا ہر قطرۂ خوں رنگ حنا سے مانگو
خوں بہا دوستو قاتل کی ادا سے مانگو

مت بناؤ ید بیضا کو گدا کا کشکول
وقت فرعون ہو جب ضرب عصا سے مانگو

جب برسنے سے بڑھے تشنہ لبی کا احساس
یورش برق ہی ساون کی گھٹا سے مانگو

کب تلک شاخ وفا لائے گی زخموں کے گلاب
کوئی تاثیر نئی آب و ہوا سے مانگو

موم کی طرح پگھل جائے گا شب کا فولاد
دست داؤد کی توفیق خدا سے مانگو

"نیند اسی نہانے والی" کے محل میں جگہ پائے گی، جسے شینگے رری اڈ نے بڑی محبت سے بنایا تھا۔
یہ دونوں تصویریں ایک ہی شخص کو پیش کرتی ہیں الیس اوزی، جسے شاعروں نے چاہا، جس کے تاثر نے تصویروں میں جان ڈالی، شعر کہلائے، جذبات ابھارے، کتنے خانگی مناقشے برپا کئے، تاکہ آخر کار ہماری چھوٹی سی ادبی تاریخ اور بعض مخصوص تصوراتی خوابوں میں زندہ جاوید ہو جائے!

اسے زولی ژودری اد اور ژوال نوری دودیے جیسے سوانح نگار میسر آئے اور شسبری اڈجیسا مصور، جس نے اپنی محبت کی ایسی بھرپور اور جذباتی شہادت چھوڑی ہے کہ اورسی نیوں کے عجائب خانے میں سبزہ زاروں اور پرچھائیوں سے گھری ہوئی اس تصویر پر جب کسی کی نگاہ پڑ جاتی ہے، تو وہ کچھ اور نہیں دیکھتا۔

پال فوژیل کی بہار آفریں نظروں میں خرام ناز سے پہلے الیس اوزی کیا تھی؟ جیسے کہ آج صبح میں نے مس اوزی کو نوترا ما کے نزدیک چھوٹی سی لنگا سے کھڑا دیکھا ہو۔ ایک چھوٹی سی بیری، پلوائی ۱۸۵۶ء والدین کی بچی، جن میں بنتی نہ تھی۔ باپ ریوسیٹ ڈبل پر زیورات بیچتے اور آخر کار اپنی بیوی سے الگ رہنے لگے تھے۔ الیس کے نانا نامور موسیقار ہونے کے علاوہ شہنشاہ کے گرجا کے نگراں اور محافظ خانے کے مہتمم تھے۔ ان موسیقار کی بیوی ملکہ پرتگال کی مقرب خاص اور چانسلر ہیگے اڈ ر کی نسل سے تھیں۔ شاید انھیں پروقار والدین نے ژولی ژودستین GULIE GUSLINE (والدہ الیس) کو وہ آزاز بخشا تھا جس کے سہارے وہ ایسی ہنگامہ خیز زندگی سکون سے گذار سکیں۔
اس نے لیٹوں میں کام کرنا شروع کیا۔ جہاں بل کور BELLECOUR محلے کے دوکان کے شیشوں سے اسے دیکھنے آیا کرتے تھے۔ پھر پیرس میں ایک اولین عاشق نے اسے تھال ریں تک پہنچایا اور ذرا ہی بعد وری اسے تے تک جہاں ایسی کتنی ہی عورتیں قسمت آزما ہوا کرتی تھیں۔ وہ یہاں کامیاب ہوئی، اور اپنے خاص معصومانہ انداز کے ساتھ وہاں تک گئی کہ جہاں سطافت روح حریف سوز زباں نہیں ہوتی پیرس میں دو برس گذار کے الیس مشہور ہو گئی تھی اور اس نے اڈ مالی کے نوجوان ڈیوک پر نظر التفات کی جو خط حسین الیس کو لکھے گئے ان میں سے بعض شائع ہو گئے ہیں۔ اس کی اداؤں سے مسحور کاتب نامعروف بھی ہیں اور وہ معروف اہل قلم بھی جو اپنی حسن پرستی کے لئے اتنے مشہور نہیں، وکٹر ایوگو اور ابن دیوماس اس پیکر حسن کے سامنے آ نہیں سکے نہ آتے تھے، جو جب دلخواہ اپنی آزادی انتخاب برقرار رکھ سکتی تھی۔ ابن دیوماس ایک خط میں اس بات کا ذکر تاسف کے ساتھ کرتا ہے۔ ایوگو کبھی اپنی عظمت پر حرف نہ آنے دیتے تھے۔ لیکن الیس اور شسیے رری اڈ کے سلسلے میں واقعات دیدہ کا ایک پورا باب ان کے شایان شان نہیں ہے۔ ..... اس کے برعکس گوتی اتیے (۵) کی بے پناہ اور پاکیزہ محبت دوسری ہی طرح کی تھی، وہ اسے بلاتے، اس سے اپنے اوج حسن پر یعنی عریاں ہونے کی درخواست کرتے، دیکھتے، اس گوشت پوست کے مجسمے کے کمال صناعت پر غور کرتے لگتے اور بس! الیس پہلے پہلے اس وجدان تام پر متعجب ہوئی اور بالآخر عادی ہو کے رہ گئی۔ وہ سو جاتی (نیند اسی نہانے والی کا تصور کیجئے!)
اسے بوڑھا ہونا بھی آیا، جبکہ بعض حیثیتوں سے اس کی شکل، بدقسمت ایسے ڈیل لے کو مرجانا آیا۔ ایک بڈھی عورت کی حیثیت سے وہ ۱۸۹۰ء کے قریب شاہراہ عثمان اور مقام سینٹ آڈگوس تیں کے کونے پر رہتی تھی، ادبی محلہ جہاں بعد میں مارسل پرودست رہ چکا ہے وہ اپنے بعض پرانے دوستوں، مثلاً ابن دیوماس سے ملتی رہتی تھی، جن سے اس کے تعلقات دوبارہ استوار ہو گئے تھے۔ اس کا کام اور زمانہ پورا ہو چکا تھا۔ تیرا ڈولپ ژدل کے خیاباں میں وہ اپنی جگہ اودیت سوان کے لئے چھوڑ گئی۔

حاشیہ ۱۔ AVIGNON جنوبی فرانس کا مشہور چھوٹا سا شہر، دریائے رہون کے کنارے آباد، اپنی سرسبزی اور حسن فطرت کے لئے قابل دید ہے۔ ۱۳۰۰ - ۹ - ۵۶ پاپائے روم نے وٹی کن VATICAN چھوڑ کر اسی شہر کو دارالحکومت بنائے رکھا۔

۲۔ CALVE MUSEE اوری نیوں کا سب سے اچھا عجائب خانہ ہے۔ یورپ میں روایت ہے کہ ہر شہر، ہر قصبہ اپنی قدیم تاریخ اور تہذیبی سرمائے کو ایک یا کئی عجائب خانوں میں محفوظ کر دیتا ہے اور اس پر برابر اضافے ہوتے رہتے ہیں۔

ان عجائب خانوں میں استادوں کی رنگین تصویریں اور بعض اوقات قلمی یا پنسل کے سفید و سیاہ خطوط خدار سب سے نمایاں جگہ گھیرتے ہیں۔

۳- CHASSERIAU (۱۸۱۹-۵۶ء) معروف فرانسیسی مصور، جزائر غرب الہند کی جمہوریت ڈومی نگن DOMINICAN REP میں پیدا ہوا۔ انگرس INGRES کا شاگرد تھا۔ اس کے سجائے ہوئے محلوں کے سقف و بام کے نقش و نگار تو غائب ہو چکے ہیں، لیکن کاغذ پر بنائی ہوئی بعض تخفی تصویریں محفوظ رہ گئی ہیں۔

۴- LOUIS LOVIOT فرانسیسی اہل قلم۔

۵- LEON VAUDOYER (۱۸۰۳-۷۲ء) مشہور فرانسیسی ماہر تعمیرات اور اہل قلم۔

۶- THEODORE DE BANVILLE (۱۸۲۳-۹۱ء) فرانسیسی شاعر جس کی نظمیں حسن تخیل اور ترشی ہوئی پاکیزہ ترکیبوں کے لئے مشہور ہیں۔

۷- PANORAMA
۸- CHANTERBINE
۹- VARIETE
} پیرس میں شام کی تفریح گاہیں جہاں موسیقی اور ہلکے پھلکے کھیل تماشوں سے آنے والوں کا جی بہلایا جاتا ہے۔

۱۰- HENRI D'ORLEANS DUC D'AUMALE (۱۸۲۲-۹۷ء) فوجی جنرل اور مورخ۔ شاہ لوئی فلپ کے چوتھے لڑکے۔ ۱۸۴۳ء میں غازی عبد القادر کے خلاف الجزائر میں کامیابی پر اعزاز پایا۔ کوں دے CONDE کے شاہزادوں کی تاریخ وغیرہ یادگار چھوڑیں۔

۱۱- RUE SAINT DENIS سین دنی نام کا گرجا پیرس کے شمال میں تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اس نام کی سڑک شمال وسطی پیرس کے تجارتی مرکز میں واقع ہے جس پر ایک خوب صورت پھاٹک ہے۔

۱۲- RENE NICOLAS DE MAUPEOU (۱۷۱۴-۹۲ء)۔ فرانس کے چانسلر جنھوں نے ۱۷۷۱ء میں پارلیمنٹ ختم کر کے شاہی کاؤنسل قائم کی تھی۔

۱۳- VICTOR HUGO (۱۸۰۲-۸۵ء) فرانس کے سب سے بڑے اہل قلم اور شاعر اور رومانویت کے سرخیل، اہم سیاست داں، قومی اسمبلی کے منتخب رکن اور ری پبلکن تھے۔ جب ۱۸۵۱ء میں بادشاہت لوٹ آئی تو ہیوگو ۱۸۷۰ء تک برطانوی جزائر میں جلا وطن رہے۔ رومانوی تحریک کے رجحانات کی نمائندگی کی اور اپنی نظموں سے نظم جدید کا راستہ کھولا۔ ان کی زندگی میں کئی معاشقوں کا ذکر آتا ہے اور پرانا راجپوت مقولہ یاد آتا ہے "جو مرد نہیں، سورما کیسے ہو سکتا ہے!"

۱۴- ALEXANDRE DUMAS-FILS (۱۸۲۴-۹۵ء) مشہور خاندان کے چشم و چراغ، زبان و ادب پر غیر معمولی عبور رکھتے تھے۔ بڑی تعداد میں تاریخی ناول لکھے، جو بہت مقبول ہوئے۔ بعض ڈرامے بھی لکھے، جو کھیلے گئے اور مقبول ہوئے۔

۱۵- THEOPHILE GAUTHIER (۱۸۱۱-۷۲ء) مشہور اہل قلم، رومانویت کے سرگرم علم بردار رہنے کے بعد ایسی نظمیں لکھیں جن میں حسن آفرینی پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ بعض ناولیں اور رومانویت کی ایک تاریخ بھی یادگار چھوڑی۔

۱۶- AIME DESCLEE- الیس کی ہم عصر آرٹسٹ۔

۱۷- BOULEVARD HAUSSMAN اوسماں یا عثمان نامور فرانسیسی جنرل تھے۔

۱۸- PLACE ST. AUGUSTIN کیتھولک عیسائیوں میں سینٹ (ولی) باقاعدہ اعزاز ہے، جو پوپ کسی عیسائی کو اس کے مرنے کے بعد بخشتے ہیں۔ یہ "ولی" مقامی یا ملکی طور پر اپنے علاقے میں زیادہ مشہور ہوتے ہیں اور ان کے نام پر سڑکوں وغیرہ کے نام رکھے جاتے ہیں۔ تیرھویں صدی عیسوی میں SUMMA MY THOLOGIAE کے نام سے لاطینی میں ان "ولیوں" کی ضخیم تاریخ لکھی گئی۔ جس کا انگریزی ترجمہ موجود ہے۔ جب سے اب تک کے اضافے مزید ہیں۔

۱۹- MARCEL PROUST (۱۸۷۱-۱۹۲۲ء) کئی ہزار صفحے کی ایک غیر معمولی تصنیف "گذرے ہوئے زمانے کی تلاش میں" A LA RECHERCHE DU TEMPS PERDU کے مصنف ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنی یادداشت کو کھنگالا ہے اور اپنی دنیز دوسرے تمام مذکورہ کرداروں کی نفسیات کی عجیب سماجی تشریح کی ہے۔ کتاب نے جدید مغربی ادب پر غیر معمولی اثر ڈالا۔ ابھی حال میں آکسفورڈ سے پروست پر دو جلدوں میں ایک مقالہ تحقیقی شائع ہوا ہے، جو موضوع پر ابھی تک حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۰- ALLEE DE TIR AUX PIGEONS تیر اندازی برائے کبوتر کے لفظی معنی ہیں، کبوتروں کا نشانہ راستہ۔ اس چھوٹی سی راہ کو کہتے ہیں جس کے بیچ میں باغ میں درختوں کی قطاریں، پھولوں کے تختے اور سبزہ زار ہوتے ہیں۔ یہاں لوگ ہوا خوری کے لئے جاتے ہیں اور مائیں بچے کھلانے لے جاتی ہیں۔ آگے ڈیرا وپی ژون پر دو رکی دے تے نامی تماشہ گاہ واقع ہے۔

۲۱- ODETTE SWANN الیس کی جانشین آرٹسٹ۔

ڈاکٹر پریم دت شرما
مترجم: محمد فوزی

منشی بساون لال شاداں

(مصنف امیر نامہ)

یہ نہایت خوش بختی کی دلیل تھی کہ "قسمت کے دھنی سپاہی" نواب امیر خاں کو منشی بساون لال شاداں جیسا قابل قدر اور جفاکش انسان مل گیا تھا جس نے فارسی زبان میں ان کی سوانح عمری "امیر نامہ" کے نام سے تصنیف کی۔ امیر نامہ نواب امیر خاں کی بہادرانہ کارگزاریوں اور سرفروشانہ معرکہ آرائیوں کی ایک طویل داستان ہے۔ پروفیسر کانون گو کے لفظوں میں "نواب امیر خاں ہندوستان کا آخری فوجی دماغ تھا" جب امیر نامہ پایۂ تکمیل کو پہنچا تو سینکڑوں اصحاب اسے دیکھنے اور مطالعہ کرنے کے کوشاں ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ چھاپہ خانہ کا رواج اپنے ابتدائی مراحل میں تھا اور نشر و اشاعت عام نہیں ہوئی تھی پھر بھی یہ قلمی کارنامہ لوگوں کے لئے ایک بہترین تحفہ سے کم نہ تھا۔ اس میں نواب موصوف کی تعریف و توصیف کے ساتھ ان کے تمام جنگی کارناموں کا بیان ہے اور راجپوتانہ کے عصری حالات نیز مرہٹوں کے عسکری واقعات بھی تفصیل سے درج ہیں۔ لارڈ ولیم بینٹنگ کے ایما پر ہنری. ٹی. پرنسپ نے اس کا انگریزی ترجمہ سنہ ۱۸۳۲ء میں کیا تھا ٹونک ریاست کے حکمرانوں نے اردو زبان میں بہت سی کتابوں کے تراجم کرائے لیکن اس وقیع تصنیف کے ترجمہ میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔

منشی بساون لال لکھنؤ ضلع کے بلگرام قصبہ کے باشندے اور سکسینہ کالیستھ تھے۔ والد کا نام شری تن سکھ رائے تھا جنھوں نے منشی جی کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور مروجہ فارسی زبان کی اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ انھوں نے خود بھی اپنی مشق و مہارت سے فارسی نثر و نظم میں اچھی دستگاہ پیدا کرلی۔ ان دنوں منشی بساون لال کے ماموں رائے داتارام اور رائے جیت رائے نواب امیر خاں کے پرائیویٹ سکریٹری تھے۔ ان کی سفارش پر نواب صاحب نے بہت جلد انھیں اپنی خدمت پر مامور کرلیا سب سے پہلے منشی بساون لال کو کرنل موہن سنگھ کے سپرد کردیا گیا کیونکہ کرنل موصوف رائے داتارام کے ہم وطن تھے۔ جب نواب صاحب کا نائب منشی جوانی پرشاد طویل رخصت پر چلا گیا تو سنہ ۱۲۳۳ھ میں بساون لال کو اس خالی جگہ پر مقرر کردیا گیا۔ نواب صاحب کی اجازت سے نئے نائب منشی کو رائے داتارام کے ساتھ کام کرنے کی آزادی دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منشی بساون لال کو نواب صاحب کی قربت کا بہترین موقع ہاتھ آگیا۔ ماموں رائے داتارام تو اپنے نوجوان بھانجے کی کارکردگی سے مطمئن تھے ہی، خود بساون لال نے اپنی لیاقت و استعداد سے نواب صاحب کو متاثر کردیا ہے۔

ٹونک ریاست کے ولی عہد نواب وزیر الدولہ منشی بساون لال کی بڑی عزت کرتے تھے کیونکہ وہ شروع ہی سے علم و فن کے دلدادہ تھے۔ انھیں کے پرخلوص اصرار پر منشی جی نے امیر نامہ لکھنے کا آغاز کیا اور سنہ ۱۲۴۱ھ میں اسے تائے تمت تک پہنچا کر نواب امیر خاں کی خدمت میں پیش کیا۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ نواب صاحب نے جستہ جستہ واقعات اپنی یادداشت کے سہارے منشی جی کو لکھوائے تھے۔ اس خدمت کے صلے میں نواب صاحب منشی جی کو جاگیر بخشنا چاہتے تھے مگر منشی جی اس کے لئے رضامند نہیں ہوئے۔ اس لئے نواب صاحب نے ان کی مرضی کے مطابق خلعت فاخرہ عطا فرمایا اور اٹھاون روپیہ ماہوار کا ایک دائمی وظیفہ مقرر کردیا۔ نواب امیر خاں کے جود و سخا کو دیکھتے ہوئے یہ ایک قدر قلیل تھی مگر منشی جی نے پھر بھی نہایت احسان مندی ظاہر کی۔ جلد ہی نواب صاحب نے انھیں امیر نامہ کی جلدیں تیار کرنے والے شعبے کا سرپرست اور نگراں بنا دیا تاکہ وہ اپنے زیر اہتمام اس کام کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں۔ دس نفری بہترین خطاطوں اور خوش نویسوں کا عملہ اسے قلم بند کرنے میں منہمک اور مصروف رہتا تھا کیونکہ نواب صاحب کا ایسا حکم تھا کہ اس کی بیس جلدیں بروقت تیار رہنی چاہئیں تاکہ خواہشمند حضرات کو بروقت بھیجی جاسکیں۔ اس تصنیف کی کئی نقلیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اعلیٰ افسران اور دیسی ریاستوں کے حکمرانوں کو بطور تحفہ روانہ کی گئیں۔

جب نواب وزیر الدولہ تخت شاہی پر متمکن ہوئے تو منشی بساون لال کو اعزاز و اکرام کے ساتھ سکریٹری کے لائق و فائق عہدے پر فائز کیا گیا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۲۵۰ھ کا ہے۔ انھیں ایام میں نواب صاحب کو ایک تجربہ کار وکیل کی ضرورت لاحق ہوئی جو کلکتہ جاکر ان کے معاملات کو سنبھال سکے۔ نواب صاحب نے اس مشکل کام کے لئے بھی منشی جی کو ہی منتخب فرمایا اور وہ بخوشی کلکتہ کے لئے عازم سفر ہوگئے۔ مرقوم ہے کہ ۲۷ رشعبان سنہ ۱۲۵۲ھ میں تین مہینے کے طویل اور جان لیوا سفر کے بعد کلکتہ پہنچے۔ جب قائم مقام گورنر جنرل سر چارلس میٹکاف سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی تو انھوں نے فارسی میں ایک تحفہ پڑھ کر سنایا اور اس کی شان میں ایک شاندار قصیدہ بھی کہا جس سے گورنر جنرل بہت مسرور و مطمئن ہوا۔

کچھ عرصہ بعد منشی جی نے نواب صاحب کو ایک تفصیلی خط بھیجا اور اس میں کلکتہ کی ناسازگار آب و ہوا اور غیر پسندیدہ خورد و نوش کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ویسے اپنے قیام کے دوران انھوں نے کلکتہ کے ادبی حلقوں میں اپنی جگہ بنالی تھی اور اپنے فرائض بھی نہایت عمدگی سے نبھا رہے تھے۔ ادھر ٹونک میں کچھ ایسے بھی اشخاص تھے جنھیں بسادن لال کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے کاوش پیدا ہوگئی تھی اس لئے انھوں نے نواب صاحب کے کان بھرنے شروع کر دئے اور شکایت کی کہ ٹونک میں تو وہ آنارام منتظم اعلیٰ بنا ہوا ہے اور کلکتہ میں بسادن لال مختار کل ہے ہم تو بالکل بے حیثیت ہو کر رہ گئے ہیں۔ نواب ٹونک کو ذاتی طور پر منشی جی سے کوئی پرخاش نہیں تھی مگر بسادن لال کے مخالفوں کو مطمئن کرنے کے لئے انھوں نے فوراً منشی صاحب کو ٹونک آجانے کی ہدایت کی۔ خلاف توقع جب انھیں یہ حکم پہنچا تو وہ بڑے کبیدہ خاطر ہوئے لیکن وہ نواب صاحب کے عادات و خصائل سے واقف تھے اس لئے کسی طرح کی لیت و لعل نہیں کی اور اسی وقت جگنا تھ پوری کی تیرتھ یاترا کا بہانہ بنا کر ٹونک کی طرف چل پڑے۔ نواب صاحب نے ان کی خاطر جمعی کے لئے سمجھایا کہ حکومت کے انتظامی معاملات میں صلاح و مشورہ کی سخت ضرورت تھی اور ان کا ٹونک میں رہنا ناگزیر تھا بعبارت مختصر منشی جی اپنے فرائض کو کما حقہٗ انجام دیتے رہے لیکن ایک دن اچانک انھوں نے نواب صاحب کے سامنے مجبور شور ناتھ کا نام دو تین بار پکارا اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ ان کی آخری رسوم مالپورہ دروازے کے پاس ادا کی گئیں، وہیں شو مندر کے قریب ان کی دھرم پتنی نے جیٹھ کرشن اشٹمی سمبت ۱۸۹۴ میں ایک کتبہ بطور یادگار لگوادیا تھا کیونکہ شومئی قسمت سے منشی جی لاولد مرے تھے۔ نواب صاحب نے ان کی بیوہ کو مالی امداد پہنچانے کی غرض سے ۵۰ روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا تھا لیکن یہ قلیل رقم بھی رفتہ رفتہ تیس روپیہ پچیس روپیہ اور آخر میں بیس روپیہ کی حد تک پہنچ گئی۔ جب اس بیوہ نے بھی زندگی سے قطع تعلق کر لیا تو منشی جی کی منہ بولی بیوہ بہن کو صرف دو روپیہ ماہوار دیئے جانے لگے مگر ٹونک کے تیسرے نواب محمد علی خاں نے اس رقم کو بھی ۱۲۸۱ھ میں بند کر دیا اور صرف یہی نہیں بلکہ منشی بسادن لال کی شاندار حویلی کو ایک ایک ہزار روپیہ دے کر زبردستی اپنے قبضہ میں کر لیا۔ منشی جی کی لاچار بہن کو بادل ناخواستہ اپنے وطن لوٹنا پڑا۔ بعد میں یہ حویلی اونچے داموں پر عبدالرحمٰن کو فروخت کر دی گئی۔ کہتے ہیں کہ اس حویلی کو منشی جی نے بڑے اہتمام سے تعمیر کرایا تھا۔ اس کا صدر دروازہ اتنا بلند تھا کہ ہاتھی آسانی سے گذر سکتا تھا۔ اندرون حویلی ایک میٹھے پانی کا کنواں تھا اور ایک خوبصورت باغیچہ بھی بنا ہوا تھا۔ منشی جی اپنے فرصت کے اوقات اسی باغیچہ میں بیٹھ کر گذارتے تھے اور یہیں ادبی و شعری ہنگامہ آرائیاں ہوتی تھیں۔ منشی جی نے نواب امیر خاں کی مدح میں ایک لاجواب مثنوی بھی لکھی تھی اور بھی دیگر ادبی کارنامے انھوں نے یادگار چھوڑے ہیں لیکن افسوس! وہ تمام "امیر نامہ" کی طرح منظر شہود پر نہیں آسکے ہیں اور نہ ہی ٹونک کے ادب نوازوں نے اس طرف کوئی توجہ دی ہے۔

مترجم: پریم ناتھ دت

تاج

(آرنلڈ کی نظم کا ترجمہ)

محض عمارت ہی نہیں جس طرح کہ عام عمارتیں ہوا کرتی ہیں
بلکہ ایک شہنشاہ کے عشق کی زبردست قلبی کشش
اسی زندہ جاوید یادگار کی محرک ہے، جو نور برساتی
اپنے تابناک حسن سے دلوں کو گرماتی اور قوت تخیلہ کو اڑان دیتی ہے
اس وقت جبکہ کوئی پری زاد
ہماری نگاہوں کے سامنے چہرے سے نقاب اٹھاتا ہے
ایسے لاثانی حسن کا منظر جس کی تشریح الفاظ میں ممکن نہیں
اور ہمارے خون کی روانی تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے اور دل بے قابو
اور اعتراف عجز میں ہم آپ سے آپ دو زانو ہو جاتے ہیں
یہاں تک کہ ہمارا سانس بھی اکھڑ جاتا ہے تو سمجھو "تاج" ایسی ہے

نوٹ:-

ہاول (HOVEL) کہتا ہے کہ یہ نظم تاج محل کی عظمت کی مکمل تعبیر ہے۔ اس کے خیال میں "تاج محل" دراصل ممتاز محل (ارجمند بانو بیگم) کی اپنی منہ بولی مورت ہے۔ مشرق کی VENUS ملنٹ ھلا (حسن کی دیوی) مجسمہ مشرق Sin
Edwin Arnold

مراسلات

ایک استفسار کا جزوی جواب

ہماری زبان مورخہ یکم مئی ۱۹۸۱ء میں جناب طاہر محسن صاحب نے چند لفظوں کی اصلیت دریافت فرمائی ہے۔ ان میں سے دو لفظوں کی حقیقت درج کی جاتی ہے۔

خلفشار: میرے مکرم مرزا جعفر علی خاں اثر مرحوم نے لفظ خلفشار کے بارے میں فرہنگ اثر میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"اس لفظ نے مجھے بڑی الجھن یا خلجان میں مبتلا کر دیا۔ بہت عام ہے مگر کسی فرہنگ فارسی یا اردو میں درج نہیں۔ اپنے عزیز اور محترم دوست پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب سے رجوع کی ان کی تحریر سے مجھے لفظ بہ لفظ اتفاق ہے اور وہی نقل کیے دیتا ہوں۔

"لفظ خلفشار نہ کسی لغت کی کتاب میں ملا نہ فارسی نثر و نظم میں کہیں نظر آیا۔ غالباً یہ لفظ ہندستان میں بنایا گیا ہے۔ اس کی اصلیت کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہا نہیں جا سکتا البتہ قیاس کہتا ہے کہ یہ لفظ مرکب ہے خل اور فشار سے۔ ابتدا میں یہ خل و فشار ہوگا بعد کو واو عطف گر گیا جو کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ فارسی میں مصدر سے حاصل مصدر بنانے کا قاعدہ معین ہے لیکن کبھی ماضی مطلق کا صیغہ حاصل مصدر کے معنی دیتا ہے جیسے شکست، گرفت، ساخت، نشست، افتاد وغیرہ اور کبھی امر کا صیغہ حاصل مصدر کے معنی دیتا ہے جیسے سوز، گداز، خراش، تاب، گردش وغیرہ۔ خلفشار میں خل اور فشار دونوں امر کے صیغے ہیں خلیدن اور فشاردن سے لیکن حاصل مصدر کے معنی دیتے ہیں یعنی چبھن اور دباؤ۔ خلیدن کا حاصل مصدر خلش ہے مگر جس طرح بعض مصدروں کے دو دو حاصل مصدر ہیں جیسے ناز اور نازش، تاب اور تابش، سوز اور سوزش، تپ اور تپش اسی قیاس پر خلش کے باوجود خل کو بھی خلیدن کا حاصل مصدر مان لیا ہے۔"

(فرہنگ اثر صفحہ ۳۲۷—۳۲۸)

کاہلا۔ میر انیس فرماتے ہیں:

گرمی کا روز جنگ کیوں کر کروں بیاں ڈر ہے کہ مثل شمع نہ جلنے لگے زباں

آگے چل کر گرمی کی شدت کے بیان میں کہتے ہیں۔

آہو جو کاہلے تھے تو چیتے سیاہ فام
پتھر پگھل کے رہ گئے تھے مثل موم خام

راقم حروف نے لفظ کاہلے پر جو فٹ نوٹ لکھا ہے وہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

"کاہلے۔ کاہلا کی جمع۔ سست، مضمحل، تھکا ماندہ۔ یہ لفظ بیشتر ہرن کی اس کیفیت کے لیے آتا ہے جو گرمیوں میں دھوپ کی شدت سے اس پر طاری ہو جاتی ہے۔ یہ لفظ ایک مدت تک مستعمل رہنے کے بعد اب متروک ہو گیا ہے۔ ذیل کے شعروں سے اس کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

کاہلا حسن کر مجھے آئے یہ چپ بیٹھے رہے
کہنے سننے کو ذرا بیمار داری کر گئے
میر حسن

گرمی رخسار سے بیمار ہوئی چشم یار
دھوپ کی شدت سے آہو کاہلا ہو جائے گا
شیخ ناسخ

گرمی میں نہیں ہے شوخی چشم یہ دھوپ سے کاہلا ہرن ہے
شاد لکھنوی پیر دبیر

(روح انیس طبع چہارم صفحہ ۲۳)

لکھنؤ ● سید مسعود حسن رضوی

غالب کا شعر

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

یہ شعر غالب ہی کا ہے۔ اس لیے اس کے نام سے منسوب ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اگر صفدر مرزا پوری اسی قافیہ ردیف میں شعر کہتے تو اس طرح ہوتا۔

چند رشحات قلم، چند ادیبوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

بے سر و سامانی کے اظہار کے لیے "تصویر بتاں" اور "حسینوں کے خطوط" کا تصور مرزا ہی کے ذہن میں آ سکتا تھا۔

امرتسر ● برہم ناتھ دت

اخبار و اذکار

جنگاؤں۔ اردو جماعتوں کا قیام

جنگاؤں: جناب محمد محبوب خاں معتمد انجمن ترقی اردو شاخ جنگاؤں نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ مستقر جنگاؤں اور مواضعات نوٹلہ، گنڈ رگڈہ، بسیرتی اور شنبتال پر جہاں اردو طلبہ کی کثیر تعداد موجود ہے اردو جماعتوں کے قیام کے لئے انجمن کی جانب سے محکمہ تعلیم اور پنچایت سمیتی جنگاؤں سے متعدد مرتبہ نمائندگی کی گئی اس تعلق سے تقریباً ایک سال سے مراسلت کا طویل سلسلہ جاری ہے لیکن حکومت و محکمہ تعلیم کی جانب سے غیر ہمدردانہ رویہ سے اردو طلبہ کو ان کی مادری زبان کی تعلیم سے محروم کیا جا رہا ہے انھوں نے حکومت اور محکمہ تعلیم سے پرزور اپیل کی کہ وہ فوری اس خصوص میں فراخدلانہ رویہ اختیار کرکے جنگاؤں کے جن مدارس میں اردو طلبہ کی کثیر تعداد ہے اردو جماعتوں کا آغاز کردے اور اس مقصد کے لئے اردو اساتذہ کا فوری بندوبست کیا جائے۔

• رہنمائے دکن

بنگلہ دیش کے سلسلے میں مشاعرہ

چنڈی گڈھ: یہاں "بنگلہ دیش" کے سلسلہ میں انجمن ترقی اردو پنجاب کے زیر اہتمام ایک آل انڈیا اردو مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے۔ مشاعرہ میں پدم شری ابو الفصاحت، جوش ملسیانی، شمیم کرہانی، ساحر ہوشیارپوری، قیس جالندھری، موہن لال ساحر کپور تھلوی، نوبہار صابر، رشی پٹیالوی، سورج تنویر، شمشاد حسرت، شوپال سحاب، کشمیری لال ذاکر اور بہت سے دیگر شعراء بھی شرکت کریں گے۔ انجمن ہذا چنڈی گڈھ کے علاوہ پنجاب دوسرے شہروں میں بھی بنگلہ دیش کے موضوع پر مشاعرے منعقد کرنے کا پروگرام مرتب کر رہی ہے۔

• موہن لال معتمد نشر و اشاعت

نئی اردو تنظیم کا قیام

حیدرآباد: جناب ایس۔ اے قادری کنوینر تلنگانہ اردو کنونشن حیدرآباد نے اطلاع دی ہے کہ ایک نئی ترکیباتی اردو تنظیم کی تشکیل طلبہ، نوجوانوں اور دانشوروں اور اساتذہ پر مشتمل کی گئی اس تنظیم اور تحریک کا مقصد جناب قادری کے مطابق اردو کو جدوجہد تلنگانہ کی عوامی تحریک سے مربوط اور ہم آہنگ کرنا اور حل طلب اردو مسائل کی یکسوئی کا لائحہ عمل مرتب کرنا ہوگا اس سلسلہ میں ڈاکٹر عالم خوندمیری، ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر داؤد منظم

مرس چندر سریواستو، مصطفے کمال، بی و یکنٹ سوامی ایم پی اے، مدن موہن ایم۔ ایل۔ اے سلیمان سکندر اسٹوڈنٹ لیڈر کے ایم عارف الدین اور نواب ظاہر علی خاں پر مشتمل ایک ایڈوائزری بورڈ کی تشکیل عمل میں آچکی ہے۔

• رہنمائے دکن

اردو کی تعلیم کا انتظام کیا جائے

الہ آباد: اندرا گاندھی اسپورٹس کلب الہ آباد کے جنرل سکریٹری جناب سراج الدین نے ایک میمورنڈم اردو کے سلسلے میں شریمتی ڈاکٹر راجندر کماری باجپئی وزیر لوکل سلف اتر پردیش کو کونسل ہاؤس لکھنؤ میں ۳ مئی کو پیش کیا شریمتی جی نے کہا کہ وہ اس پر سنجیدگی سے غور کریں گی اور ممکن حد تک شکایت دور کریں گی۔

میمورنڈم میں کہا گیا کہ اتر پردیش میں کروڑوں لوگ ایسے ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچوں کے اردو پڑھنے کا معقول انتظام کیا جائے لیکن گزشتہ ۲۴ برسوں میں ریاستی حکومت مناسب انتظام نہ کر سکی حکومت کی طرف سے اردو کے لئے جن سہولتوں کا اعلان کیا گیا اس پر افسران متعلقہ نے عمل نہیں کیا میونسپل بورڈ ڈسٹرکٹ بورڈ اور کارپوریشن کے انتظام میں چلنے والے اسکولوں میں یہ پابندی ہے کہ ایک کلاس میں دس یا اسکول بھر میں چالیس لڑکے ہوں تو اردو پڑھنے کا انتظام ہو سکتا ہے یہ تعداد کی پابندی ایسی ہے جس سے اردو پڑھنے والے اردو کی تعلیم سے محروم ہو جاتے ہیں یہ پابندی ہٹائی جائے اور ہر اسکول میں ایک اردو داں ٹیچر کا تقرر کیا جائے اردو پڑھنے والے طلبہ کو کورس کی کتابیں ہو صرف نہیں ملتی ہیں ایسا انتظام کیا جائے کہ اسکول کھلتے ہی کورس کی کتابیں مل سکیں۔

میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ اور کارپوریشن میں اردو میں لکھی ہوئی درخواستیں لی جائیں اور جواب بھی اردو میں دیا جائے سڑکوں پر بورڈ اردو میں بھی لگائے جائیں اور لائبریریوں کو اردو کتابیں خریدنے کے لئے مزید امداد دی جائے۔

• قومی آواز

تبصرہ

عتیق احمد صدیقی

کتاب: صحرا میں اذان
مصنف: گوپال متل
صفحات: ۱۱۲
اشاعت: ۱۹۷۰ء
قیمت: چار روپے
پتہ: مکتبہ تحریک ۵۵ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج۔ دہلی

گوپال متل کی شخصیت اردو ادب میں محتاج تعارف نہیں تصنیف و تالیف اور ترجموں کے ذریعہ انھوں نے اردو ادب میں اپنا ایک مقام پیدا کیا ہے "صحرا میں اذان" غزلوں اور نظموں پر مشتمل آپ کا مجموعۂ کلام ہے۔

مجموعہ کی پہلی نظم پر ۱۹۳۶ء درج ہے جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ باقی غزلیں اور نظمیں اس کے بعد کی ہیں۔ نظمیں اگرچہ مختصر ہیں لیکن ان میں سے کچھ اچھی نظموں میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ ان میں سے بعض شاعر کے پر امید ولولہ کی عکاس ہیں۔ شاعر حالات کی سخت گیری اور جبر سے چشم پوشی نہیں کرتا لیکن اس صورت حال سے نہ ہراساں ہے، نہ مایوس اور نہ بیزار۔ وہ ان نامساعد حالات کے خلاف نبرد آزما ہونے کی جرأت و خواہش بھی رکھتا ہے اور تلقین بھی کرتا ہے، ان کے جلد تبدیل ہو جانے اور انسان کے کامیاب و کامراں ہونے پر اس کو یقین ہے۔ بیشتر نظموں میں امید کا یہ کوندا لپکتا ہوا نظر آتا ہے ؎

قافلہ نور سحر کا ہے بہت ہی نزدیک
جلد ہونے کو ہے خورشید درخشاں کی نمود

(صبح کاذب)

غزل بڑی قاتل صنف سخن ہے۔ غزل کہہ لینا جتنا آسان ہے، اسی قدر اس میں نئی بات کہنا مشکل ہے اور اس کو "بامزہ" بنانا اور بھی مشکل۔ اس مجموعے میں جا بجا ایسے اشعار نظر آجاتے ہیں جن پر نگاہ ٹھہر جاتی ہے۔ ان اشعار میں لطف تغزل ملاحظہ ہو ؎

یوں دل کو چھیڑ کر نگہ ناز جھک گئی
چھپ جائے جیسے کوئی کسی کو پکار کے

ناز کر اپنے فلک سیر تخیل پہ مگر
جو ترے پاؤں سے لپٹی ہے وہ زنجیر بھی دیکھ

آرام جاں بھی راحت قلب و نظر بھی ہے
کیا تیرے التفات کا پیکر ہے چاندنی

اب وہ نہیں ہے جلوۂ شام و سحر کا رنگ
تیرا جمال شامل حسن نظر نہیں

دل یہ کہتا ہے کہ حسن اس کا جہاں تاب بھی ہو
اور پھر یہ بھی کہ ہم ہی اسے تنہا دیکھیں

زمانہ کے تقاضے کا اثر ہے کہ کہیں کہیں ایسے اشعار بھی نظر آجاتے ہیں ؎

پورے ملبوس میں اس شخص کو ننگا دیکھو
چشم بینا ہے تو پھر یہ بھی تماشا دیکھو

وضع داری محبت کے منافی ہے تو ہو
آج کالر پہ نیا پھول سجایا جائے

کتابت و طباعت بہت عمدہ اور اردو کتابوں کے لئے قابل رشک و قابل تقلید ہے۔

باقی صفحہ ۱۲ سے آگے

کی کوشش کی جاتی ہے۔ تقررات اور ترقیوں میں عموماً ان نوجوانوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے جو اپنے ذہن سے سوچتے اور اپنی زبان سے بولتے ہیں۔ علم اور صلاحیت کی کسوٹی یہ ہے کہ آپ صاحب کرسی کی ہر بات پر کتنے زور سے آمنّا و صدقنا کہنے کے اہل ہیں، طباعی اور ذہانت کی شناخت یہ ہے کہ آپ روایتی معتقدات کو کتنے اندھے پن سے اپنائے رکھنے پر قادر ہیں۔ اور اس منفی ذہنی تربیت میں سرخیل کارواں بھی شامل ہوتے ہیں اور وہ بھی جنھیں سربراہوں کو خوش کرکے اپنے لیے کچھ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس حمام میں سب کو نہ سہی کسی نہ کسی موقع پر بہت سوں کو ننگا ہونا پڑتا ہے۔ ان لوگوں سے توقع کی جاتی ہے کہ یہ قوم کو علم کی روشنی اور کردار کی صلابت سے مالا مال کریں گے۔

ادیبوں شاعروں اور فنکاروں کے قول و عمل کا تضاد دیکھنا ہو تو یہ دیکھیے کہ وہ ادنیٰ سے ادنیٰ اختیار رکھنے والے کے حضور کیا رویّہ اختیار کرتے ہیں۔ معمولی سے معمولی سرکاری اعزاز و انعام حاصل کرنے کے لیے سفارشوں، اثرات اور تعلقات کے کیسے کیسے تانے بانے ملائے جاتے ہیں۔ سارتر نے نوبل انعام کو اس لیے ٹھکرا دیا کہ وہ اپنے قلم کی آزادی کو آلودہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہمارے بزرگ یہ تو بہت کہتے ہیں کہ مغرب زدہ ذہن رسل اور سارتر کا کلمہ پڑھتے ہیں، مگر اپنے عمل سے ان کی سی اخلاقی جرأت کا ثبوت شاید ہی فراہم کرتے ہوں۔ ایک ساہتیہ اکاڈمی انعام کے لئے کیا کیا نہیں کیا جاتا۔ یہ تو اونچی سطح کی باتیں ہیں، اگر آپ شاعروں، ادیبوں کے قبیلے کو پست ترین سطح پر دیکھنا چاہتے ہوں تو مشاعرے میں دیکھیے۔ مشاعرہ جو اردو کی مقبولیت کا ثبوت سمجھا جاتا ہے۔ شاعر اور شاعری کے سستے پن کا چیختا اشتہار ہے۔ دیکھیے کہ پندار شاعرانہ کی بات کرنے والے، فن کی خلاقی پر نازاں اور بے نیازی کے دعوے دار کس کس طرح وزیروں، امیروں، صنعت کاروں، سیٹھوں اور ان کے کارندوں، بے اقتدار نوابوں، رجواڑوں اور شہزادوں کی خوشامد کرتے ہیں۔ اور اس تذلیل فن کا مقصود و منتہا یہ ہوتا ہے کہ ان کی داد میں چند کھوکھلے لفظوں، معاوضے میں کچھ کاغذی نوٹوں اور دعوتوں میں کچھ اور شاعروں کا اضافہ ہو جائے۔ جاہ و فن سے بے خبر ہیں، فن کاری کے دعوے دار جاہ کی نیاز مندی ہی کو منتہائے فن سمجھتے ہیں۔

آزادی کے بعد سرکاری عہدوں، اعزازوں، انعاموں اور وظیفوں کے امکانات جس طرح پیدا ہوئے ہیں اسی طرح فنکاروں کے اخلاقی رویّے زوال پذیر ہوئے ہیں۔ اس جرم میں قدیم، جدید، ترقی پسند سب برابر کے شریک ہیں۔ بیشتر ترقی پسند ترقی پسندی کو زندگی کا انقلاب آفریں رویّہ نہیں بلکہ محض ادب کا ایک فارمولا سمجھتے ہیں، اسی طرح اکثر جدیدیت پرست جدیدیت کو ایک ذہنی رویّہ، ایک سماجی اور تہذیبی نظریہ نہیں بلکہ محض ادب کا ایک چلتا ہوا فیشن سمجھتے ہیں۔ اپنے اس عمل کے جواز میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ادب اور زندگی میں مطابقت ضروری نہیں، یعنی ایک ادیب زندگی میں سمجھوتا بازی، بے ایمانی، خوشامد اور دروغ پر عامل ہونے کے باوجود اپنی تحریروں میں اصول پرستی، دیانت، بے نیازی اور سچائی کی بات کر سکتا ہے۔ میں ان حضرات سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ تمام اقدار صرف ایسے بے جان الفاظ ہیں جن کے معنی لغات ہی کے سینوں میں محفوظ رہنے کے لئے ہیں؟ کیا الفاظ کے خالق ان کو معانی عطا نہیں کرتے؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں دیا جائے تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ علم و فن، ادب و تدریس سے زیادہ منافع بخش کاروبار اور بہت سے ہیں جو الفاظ کے معانی کی توثیق کا مطالبہ نہیں کرتے۔

عمل اور نظریے، زندگی اور ادب و فن میں یہ دوری عدم مطابقت اور تضاد ہی بڑی حد تک ہمارے ادب و علم کی بے مائگی کا ذمہ دار ہے۔ جب الفاظ کا استعمال کرنے والے ہی ان کے معنی کا احترام نہ کریں تو ان میں جان کہاں سے پیدا ہوگی۔

موجودہ معاشرے کے بحران کردار کا علاج اسی طرح ممکن ہے کہ ہم علم، ادب، سیاست اور عام زندگی میں الفاظ کی تقدیس کا احترام کریں اور اپنے عمل سے ان معانی کی توثیق کریں، جو ان لفظوں میں مضمر ہیں — یعنی ہم اپنے الفاظ کو اپنی زندگی سمجھیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو علم، ادب، سیاست سب کھوکھلے الفاظ کے بے معنی انبار کے سوا کچھ نہیں۔

ڈاکٹر وحید اختر

میرا صفحہ

"اگر میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے پر سورج رکھ دیا جائے اور مجھ سے کہا جائے کہ اپنے الفاظ کے اعلان سے باز آجاؤ تو میں ساری دنیا کی دولت پر اپنے الفاظ کو فوقیت دوں گا۔"

یہ یا اس سے ملتے جلتے الفاظ پیغمبر اسلام نے ارشاد فرمائے تھے سقراط کے لئے زنداں سے فرار کی راہ کھلی ہوئی تھی، مگر اس نے کہا تھا کہ "اگر میں جان بچا کر بھاگ جاؤں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ میرا فلسفہ جھوٹا تھا۔" یہ وہ قابل احترام ہستیاں ہیں جنھیں اس حقیقت کا عرفان حاصل تھا کہ الفاظ کو آدمی کا عمل معنی کی روشنی سے منور کرتا ہے۔ فلسفہ، سائنس، ادب، فنون لطیفہ، مذہب سب صداقت کی تلاش سے عبارت ہیں، یہ تلاش اسی وقت معنی خیز ہوتی ہے، جب الفاظ جو بظاہر بے جان ہوتے ہیں، زندگی کی روح بن جائیں۔

والٹیر ایک محفل میں بڑے زور شور سے بحث کر رہا تھا، انقلاب سے قبل کے فرانس کے امرا کو یہ طرز کلام ناگوار گزرا، کسی نے پوچھا یہ گستاخ نوجوان کون ہے؟ والٹیر نے جواب دیا "جناب! یہ نوجوان وہ ہے جس کی عزت اس کے اپنے کام کا نتیجہ ہے، بزرگوں کی چھوڑی ہوئی دولت و جاہ کا صدقہ نہیں" اس رات کی صبح ہونے سے پہلے والٹیر قید خانے میں تھا۔

میر آصف الدولہ کے حضور سے بے باکانہ اٹھ آئے اس لئے کہ بادشاہ کی توجہ کلام کی طرف نہیں مچھلیوں کی طرف تھی۔ خواجہ میر درد کی محفل میں شاہ عالم نے تکلیف کا عذر کر کے پاؤں پھیلا دئے تو شاعر نے ٹوک دیا "اگر تکلیف تھی تو فقیر کی محفل میں آنا کیا ضرور تھا؟"! انیس کو جب ایک امیر کے حسب فرمائش مرثیہ نہ پڑھنے پر یہ دھمکی دی گئی کہ "اگر آپ نے مرثیہ نہ پڑھا تو وظیفہ بند ہو جائے گا۔" تو حسین کے ثناخواں نے جواب دیا "میں اپنی جوتی کے ایک تسمے کو وظیفے سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں"۔ روایت ہے کہ حسرت موہانی حالانکہ مجرم سرکار نظام سے راتوں رات اس لئے باہر نکل گئے کہ بادشاہ ان کا وظیفہ مقرر کرنا چاہتا تھا اور وہ وظیفہ خواری کو آزادی فروشی جانتے تھے۔ خلیفہ ہارون رشید اپنے وقت کے مشہور صوفی فضیل بن عیاض سے ملنے گیا۔ فقیر کی کٹیا میں اندھیرا تھا بادشاہ نے ہاتھ ملایا تو جاہ و حشمت سے کنارہ کش قلندر نے کہا "کیا نرم ہاتھ ہے خدا اسے جہنم کی آگ سے محفوظ رکھے"۔ اس طرح کے واقعات سے ادب و مذہب کی تاریخ بھری پڑی ہے سائنس کے وہ نظریات و حقائق جن کا ہماری نظر میں آج انسانی کردار سے کوئی تعلق نہیں، اس لئے سچے مانے جاتے ہیں کہ ان کی صداقت کی خاطر برونو نے زندہ جلنا منظور کیا اور گلیلیو نے صعوبتیں اٹھائیں۔

علم، ادب، مذہب ہر میدان میں الفاظ کا اعتبار اس سے قائم ہوتا ہے کہ ان کو ادا کرنے والے اپنے عمل میں کس حد تک ان کی توثیق کرتے ہیں۔ تمام مقدس الفاظ کو تقدیس و احترام اصداقت و یقین ان آدمیوں نے عطا کیا ہے، جو انھیں اپنی زندگی اور دنیاوی آسائش سے زیادہ قیمتی سمجھتے تھے۔

ہمارے ملک میں آج کتنے دانشور، عالم اور فنکار ایسے ہیں جو اپنے الفاظ کی توثیق اس طرح اپنے عمل سے کرتے ہیں؟ یہ شکایت تو عام ہے کہ الفاظ معانی سے اپنا رشتہ کھو چکے ہیں لیکن یہ نہیں سوچا جاتا کہ الفاظ کی لایعنیت اور بے حرمتی کے ذمہ دار وہی ہیں جنھیں الفاظ کی معنویت و تقدس کا علمبردار ہونا چاہئے تھا۔

ہمارے معاشرے میں مذہب بے قدر اس لئے ہے کہ علمائے دین کے اعمال ان اقوال کی رات دن تکذیب کرتے ہیں جو ان کی زبان کا زیور ہیں۔ ہمارے یہاں سائنسی رویہ اس لئے پیدا نہیں ہو سکا کہ سائنس کے اساتذہ سائنس کے نظریات کو تجربہ گاہوں اور کلاس روم تک محدود رکھ کر زندگی میں فرسودہ توہمات کے اندھیروں کو سرمایۂ نجات مانتے ہیں۔ ہمارے ملک میں سیاسی نظریات خصوصاً سوشلزم اور سیکولرازم اس لئے بے معنی ہیں کہ ان کے علمبردار سیاست داں ان کو اپنے عمل سے پامال کرتے ہیں۔ کردار کے بحران کا رونا تو سب روتے ہیں مگر وہ جنھیں نئی نسلوں کے کردار کا امانت دار بنایا گیا ہے تخریب کردار کے سب سے زیادہ ذمہ دار ہیں۔ کسی قوم کے کردار کی تشکیل کی ذمہ داری اس کے قائدین، ادیبوں اور دانشوروں (معلمین و علما) پر عاید ہوتی ہے۔ سیاست دانوں کی بے اصول سمجھوتہ بازی، بددیانتی، اقربا پروری، لسانی، علاقائی اور مذہبی عصبیت، تنگ نظری، مفاد پرستی، اقتدار سے چپٹے رہنے کی ہوس ایسا کھلا ہوا راز ہے جس پر روشنی ڈالنا تضیع اوقات ہوگا، علما و معلمین کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ دانش گاہیں اخلاق و کردار کی تربیت نہیں کرتیں۔ طلبہ کا کردار بگاڑتی، انھیں خوشامد، جھوٹ، ریاکاری، مصلحت اندیشی اور سچ سے نفرت کا درس دیتی ہیں جو تدریس کے جتنے اعلیٰ منصب پر فائز ہوتا ہے، وہ نوجوانوں کے کردار کو مسخ کرنے میں اتنا ہی زیادہ حصہ لیتا ہے۔ اخلاقی تربیت کو تو جانے دیجئے، ذہنی تربیت کا فرض بھی یوں ادا ہوتا ہے کہ ادعائیت کو رواج، تعصبات کو پختہ تر اور روایتی رسمی تصورات کو زیادہ سے زیادہ گہرا کرنے

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ پرنٹر و پبلیشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پریس علی گڑھ میں چھپا یا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا
REGD. NO. L. 922 فون نمبر ۲۹ R. NO. 2186/57